ڈاکٹر اقلیمہ ناز

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی ، راولپنڈی

بانو قدسیہ کے ناولوں میں صوفیانہ تصورات

Dr. AqlimaNaaz

Assistant Professor, Urdu Department,

Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi

Mystic Imageries in BanoQudsia's Novels

Bano Qudsia is a well known prose writer of urdu whose charismatic style and unique diction make her writings prominent. She wrote number of novels "Raja Gidh", " Hasil Ghat", " Shehry Bymisal", " Shehry Lazawal Aabad wairany", " Mom ki Ghalliann", " Aik Din", and " Purwa". There are elements of mysticism in her novels. This article reveals her as mystic prose writer that is actually the extension of her spiritual thoughts, presented in the form of fiction.

تصوف کے موضوع سے بانو قدسیہ کی طبعی مناسبت ہے۔اس لیے وہ زندگی کی خارجی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کو باطنی شعور اور روحانی بالیدگی کے ساتھ پیش کرتی ہیں ۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے علم وعرفان کے سفر میں پیش آنے والی پیچیدگیوں اور دشواریوں کو اس طرح سے پیش کرتی ہیں کہ ان کا قاری بیک وقت خارجی اور داخلی سطح پر سفر کرتا نظر آتا ہے۔ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روحانیت کی منزل کو پانے کے لیے انتہائی صبر وتحمل اور مسلسل ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے جو شخص کڑی آزمائشوں سے گزر کر اس منزل کو حاصل کر لیتا ہے وہی بامراد ہوتا ہے۔

ناول ''راجہ گدھ'' کا موضوع ہی متصوفانہ جہات لیے ہوئے ہے۔اس ناول میں رزق حلال اور حرام کے فرق کو روح اور روحانیت کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں مصنفہ نے انسانی سرشت کے مسائل کو بیان کیا ہے کہ رزق حرام سے فرد کی روح میں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار پیدا ہوتا ہے جس سے معاشرے میں موجود لوگ بے چینی ،اضطراب اور دیوانگی جیسی روحانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول دو ہری سطح پر سفر کرتا نظر آتا ہے۔ایک طرف عشق لاحاصل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی ونفسیاتی مسائل ہیں جبکہ دوسری طرف مذہب، روحانیت اور ماورائیت کے نقطۂ نظر سے ان مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔

بنیادی طور پر ناول کی کہانی سیمی اور آفتاب کی محبت کے گرد گھومتی ہے تاہم یہ محبت دنیاوی تقاضوں سے آگے بڑھ کر

روحانی سطح پر سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔محبت کا یہ سفر اس وقت شروع ہوا جب کسی خاص لمحے میں دونوں روحیں ایک ہی حصار میں مقید ہوگئیں۔یہی وہ فیصلہ کن لمحہ تھا جب آفتاب کے دل کے موسم، رنگ حتیٰ کہ دھڑکنیں تک سیمی کے دل میں منعکس ہونے لگیں اور سیمی کی زندگی ساکت اور جامد مجسمے کی مانند رک گئی۔

> آفتاب اٹھا۔اس نے اپنے دونوں بازو صلیب کی طرح اٹھائے۔آدھی آستین والی قمیض میں اس کے دونوں بازو شہری گھاس سے اٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔کھڑکی سے آنے والی روشنی اس کی براؤن آنکھوں میں چمکتے شہد جیسی روشنی پیدا کر رہی تھی اور اس وقت وہ اولمپک کھیلوں میں آگ کی مشعل اٹھانے والے کھلاڑی کی طرح خوبصورت، کنوارہ اور مقدس نظر آ رہا تھا۔شاید اسی لمحے سیمی نے اس کی طرف دیکھنے کی غلطی کی اور دیوانی ہوگئی۔۱

سیمی کی محبت میں سچائی موجود ہے اس لیے آفتاب کو کھونے کے بعد اس میں غیب کا علم جاننے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ سیمی اپنی ذات کے کشف سے اس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں اسے غیر معمولی قوتیں حاصل ہوگئی ہیں۔آفتاب کی محبت نے اس پر اپنی ذات اور کائنات کے بہت سے راز منکشف کر دیئے ہیں۔اس لیے وہ حال میں رہتے ہوئے بھی مستقبل کے بارے میں جاننے لگی ہے۔اسے حالات و واقعات کے رونما ہونے سے پیشتر ہی ان کے بارے میں علم ہو جاتا ہے اور پھر وہ واقعات من و عن حقیقتاً بھی رونما ہو جاتے ہیں۔آفتاب کی شادی سے ایک رات پہلے وہ قیوم کو آفتاب کی شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔

> قیوم۔۔۔تم مانو گے تو نہیں۔۔۔لیکن مجھے پتہ چل گیا تھا۔پہلے ہی کہ اس کی شادی کس دن ہوگی۔ میں نے کارڈ ملنے سے بہت پہلے کل کی تاریخ اپنی نوٹ بک میں لکھی تھی۔۔۔تمہیں کیسے شک تھا۔کیسے؟ بس مجھے معلوم تھا۔۔۔کہ وہ چودہ تاریخ۔۔۔اتوار کا دن۔۔۔آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہوں گے اور اس کی شادی کی رات بارش ہوگی گرج چمک کے ساتھ۔تم جاؤ گے نا اس کی شادی پر۔۲

''راجہ گدھ'' کا مطالعہ کرنے کے بعد دیوانگی کے مختلف محرکات سامنے آتے ہیں۔تاہم ان سب محرکات کا تعلق جسمانی نقائص سے قطع نظر روحانی عوارض سے ہے۔روح کی سطح پر انسان جس بے چینی، اضطراب اور نا آسودگی جیسی کیفیات کا شکار ہوتا ہے وہ اپنی انتہائی سطح پر پہنچ کر انسان کو دیوانگی سے دوچار کرتی ہیں۔دیوانگی کا ایک محرک عشق لاحاصل ہے۔

> مانے نہ مانے کوئی۔۔۔اصل پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔۔۔صرف ایک وجہ، عشق لاحاصل ۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔۳

کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی قابیل کے عشق لاحاصل سے دیوانگی نے جنم لیا۔بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' میں اس واقعے کا حوالہ دے کر یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ دیوانگی اسی واقعے کے بعد دنیا میں متعارف ہوئی۔یہ پہلا موقعہ تھا جب ایک انسانی وجود کو ختم کیا گیا۔گویا انسانیت کا انسانیت کے ہاتھوں یہ پہلا قتل ہی دیوانگی کا محرک بنا۔قابیل کے لیے اپنی لاحاصلی کو برداشت کرنا جب مشکل ہوگیا تو وہ اس ذہنی اذیت کا شکار ہوا جس نے اسے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔یہیں

سے دیوانے پن کا خمیر انسانی لہو میں شامل ہوا۔ ''راجہ گدھ'' میں سیمی کا کردار بھی اسی لا حاصلی کے کرب سے دوچار ہوا ہے جس سے قابیل ہوا تھا لیکن بانو قدسیہ نے سیمی کے مقابل قیوم کا کردار پیش کر دیا ہے جس کے وجود پر وہ لا حاصلی کا سارا ملبہ ڈال کر چند لمحوں کے لیے پُرسکون ہو جاتی ہے۔

دیوانگی کا دوسرا محرک جسے بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' میں مدِ نظر رکھا ہے وہ ہے لامتناہی تجسس۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ ہمہ وقت سوال کرتا ہے کیوں؟ کیسے؟ کب؟ اور جب اسے ان سوالوں کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا تو وہ اضطراب کا شکار ہوتا ہے اور پھر یہی اضطراب اسے دیوانگی سے ہمکنار کرتا ہے۔ ''راجہ گدھ'' میں قیوم کا کردار ہی راجہ گدھ ہے اس لیے اسے ہمیشہ مردار سے ہی واسطہ رہا ہے۔ اسے اس سوال کہ میری تقدیر میں مردار ہی کیوں؟ نے دیوانہ کیا ہے۔

> میرے اندر سیمی کے مرنے سے کئی سوال اُبھر آئے تھے اور ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے کوئی موجود نہ تھا۔۔۔ سیمی کے مرنے کی کیا وجہ تھی۔۔۔ اگر کوئی خدا تھا تو اس نے اس جیسی لڑکی کو مرنے کیوں دیا؟۔۔۔ اگر روح موجود تھی تو پھر وہ اب مجھ سے کیوں مل نہیں سکتی تھی۔۴

بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' میں دیوانگی کے جن پہلوؤں کے حوالے سے بحث کی ہے ان میں سب سے منفرد اور انوکھا پہلو ''رزقِ حرام'' ہے۔ یہی اس ناول کا مرکزی موضوع بھی ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

> میری تھیوری یہ ہے کہ جس وقت رزق حرام جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی genes کو متاثر کرتا ہے۔ رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور Radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزق حرام سے genes تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں۔ نسل انسانی سے یہ جینز جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے، جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کر لو رزق حرام سے ہماری آنے والی نسل کو پاگل پن ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق حرام کھانے کا چسکا پڑ جاتا ہے، وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں۔۵

بانو قدسیہ نے ناول میں یہ تھیوری پروفیسر سہیل کی زبانی پیش کی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی کتاب ''اردو ناول کے بدلتے تناظر'' میں ''راجہ گدھ'' میں روحانی پہلوؤں کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں۔

> ناول میں بانو قدسیہ نے انسان کی تخلیق، اس کے ذہنی و فکری ارتقاء، اس کی جنسی نفسیات، اس کی تہذیب، مذہب اور تصوف کے حوالوں سے کائنات میں اس کے مقام سے بحث کی ہے مگر ان سب باتوں کا تانا بانا وہ فکری لحاظ سے تصوف و روحانیت سے جوڑ دیتی ہیں اور اپنے ایک اہم کردار پروفیسر سہیل کی وساطت سے قاری پر یہ تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہمارے تمام معاشرتی عوارض کا حل روحانیت میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہماری بداعمالیوں اور مغربی فلسفوں نے ہماری روح پر جو زخم

ڈالے ہیں ان کا علاج فرائڈ کے نسخوں میں نہیں ملے گا کیونکہ اس کا طریقہ علاج روحانیت کو انسانی ذات سے خارج کر کے وضع کیا گیا ہے۔اس تناظر میں بانو قدسیہ نظریاتی کمٹمنٹ کی ناول نگار ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں لیکن ایک بات واضح رہے کہ بانو کے یہاں کہانی کا پورا پس منظر پاکستانی معاشرہ ہے البتہ جب وہ اپنے نقطہ نظر کو روحانیت یا یوں کہہ لیجئے کہ مذہب کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں تو یہ پس منظر توسیع اختیار کر کے تمام عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔٦

مصنفہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رزق حرام میں ایسے منفی چارجز ہوتے ہیں جو انسانی سوچ اور فکر پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں جس سے انسان ذہنی پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ مذہبی حوالے سے بھی اس نقطے کی وضاحت کرتی ہیں کہ ہمارے مذہب میں مردار کو اسی لیے حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ اخلاقی اور روحانی تغیرات کا باعث بنتا ہے اور پھر یہی تغیرات دیوانگی کا محرک ٹھہرتے ہیں۔''راجہ گدھ'' میں بانو قدسیہ کے تمام کردار رزق حرام کھانے سے دیوانگی کا شکار ہوتے ہیں۔اس رزق کا تعلق جسمانی اور روحانی دونوں طرح کے رزق سے ہے۔

جو کوئی بھی حرام رزق کھاتا ہے اگر خود دیوانہ نہیں ہوتا تو اس کی آنے والی نسلیں اس سے ضرور متاثر ہوتی ہیں۔اس کے لہو کی ساخت کچھ اس طور پر بدلتی ہے کہ بالآخر دیوانہ پن اسی رزق حرام کی وجہ سے اس کی پشتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔٧

''راجہ گدھ'' میں بانو قدسیہ نے دیوانگی کی ایک دوسری قسم بھی بیان کی ہے۔یہ وہ دیوانگی ہے جو رزق حلال اور حرام کے علاوہ ایک تیسری قسم کے رزق سے پیدا ہوتی ہے۔جو روح کو توانائی عطا کرتا ہے اور انسان کو آگہی و عرفان کی دولت سے نوازتا ہے۔اس رزق سے genes صدیوں کا ارتقاء لمحوں میں طے کرتے ہیں اور انسان دیوانے پن کی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی راز، راز نہیں رہتا اور حیات و کائنات کی مخفی قوتیں اس پر ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ یہ دیوانگی کی وہ قسم ہے جو خدا اپنے مخصوص بندوں کو عطا کرتا ہے۔

ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو ارفع و اعلیٰ بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے۔۔۔پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے۔۔۔دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں۔لیکن وہ اوپر اوپر اور اوپر چلتا جاتا ہے۔حتیٰ کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے۔عام لوگ اسے بھی پاگل سمجھتے ہیں۔٨

ناول میں آفتاب کا بیٹا افراہیم دیوانگی کی اس سطح پر ہے جہاں اسے کشفی صلاحیتیں حاصل ہوگئی ہیں اور وہ ان دیکھی سر زمینوں اور لوگوں کے بارے میں باتیں کرنے لگتا ہے۔اس کا ذہن ایک اور سمت دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔آفتاب قیوم کو افراہیم کی دیوانگی کے بارے میں بتاتا ہے۔

افراہیم کہتا ہے کہ اس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے۔۔۔وہ اپنے آپ کو۔۔۔دنیا کا نجات

دہندہ سمجھتا ہے ۔۔۔کبھی کبھی وہ فرفر عربی بولنے لگتا ہے ۔۔۔کبھی ۔۔۔عبرانی میں باتیں کرتا ہے ۔۔۔میں ۔۔۔اس کے خوابوں سے تنگ آ گیا ہوں قیوم ۔۔۔وہ کہتا ہے کوئی فرشتہ اسے پھل کھلانے آتا ہے۔۹

پورے ناول میں روح اور روحانیت کے حوالے سے بانو قدسیہ کے متصوفانہ خیالات کی وضاحت کی گئی ہے۔موت کے بعد روح کی حقیقت اور پھر انسانی سطح پر کشف اور ریاضت سے روحوں سے ملاقات کرنا یہ تمام خیالات مصنفہ کے پختہ روحانی اعتقادات کی وضاحت کرتے ہیں۔ناول کے آخری حصّے میں قیوم ذہنی کرب اور ضمیر کی چبھن سے چھٹکارا پانے کے لیے سائیں جی کے ڈیرے پر جانے لگتا ہے۔سائیں جی اسے ریاضت کے ذریعے سیمی تک پہنچنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔اگرچہ وہ اس ریاضت سے سیمی تک تو نہیں پہنچ سکتا لیکن اس دوران قیوم پر کئی اسرار منکشف ہوتے ہیں اور اسے غیبی طاقتوں کا بھی ادراک ہونے لگتا ہے۔

تہجد کے وقت تک مجھے جنگل کی طرف سے لاکھوں آوازیں آتی ہیں۔پھر فجر کے بعد خاموشی ہونے لگتی ہے کہ اوپر دل کی دھڑکن بھی گھڑی کی ٹک ٹک جیسی سنائی دیتی ہے۔سارے مسام کھڑے کھڑے رہتے ہیں۔نتھنوں میں کئی قسم کی خوشبوئیں آتی ہیں اور لگتا ہے کہ عین گدی کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ اپنے پر پھڑ پھڑا رہا ہے۔میں نے سائیں جی سے پروں کا ذکر کیا تو بولے:''دیکھ بیٹا پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ دیوانے ہو جاؤ گے۔''۱۰

''ایک دن''میں بانو قدسیہ نے محبت کے روحانی اور جذباتی پہلوؤں کے حوالے سے بحث کر کے صوفیانہ عناصر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ہاں محبت ایک سلگتی ہوئی کیفیت کا نام ہے جو ایثار و قربانی کے جذبے سے لبریز ہوتی ہے جو ایک خاص لطف و انبساط بھی رکھتی ہے۔اس کیفیت میں انسان کی روحانی آسودگی کا پہلو بھی نظر آتا ہے اور اس کے جذباتی مسائل بھی ایک نئی راہ پاتے ہیں۔محبت اس کائنات کا مقدس اور معطر جذبہ ہے تاہم جب یہ محبت جنس مخالف سے کی جائے تو اسے محض پرستش تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہاں صنفی تقاضے بھی سر ابھارنے لگتے ہیں۔محبوب کو دیکھنا اور دل میں اس کی عبادت کرنا اوّلین درجہ ہے۔اس درجے کو پا لینے کے بعد محبت آگے بڑھنے کا مطالبہ کرتی ہے اور محبّ اپنے محبوب کے قرب کا متمنی ٹھہرتا ہے۔ان ناولٹ میں معظم اور زرقا کی ملکوتی محبت کو پانچ سال گزر گئے ہیں۔دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی ہے لیکن اب معظم چاہتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کو انسانی سطح پر لا کر پیار کرے۔

خالی محبت کا نشہ ہی بہت ہوتا ہے۔ہولے ہولے جب نظر کی منزلیں طے ہو جائیں گی۔مسکراہٹوں کے خزانے ختم ہو جائیں گے۔میٹھی میٹھی باتوں کا خمار اتر جائے گا۔تو محبت ہل من مزید کا نعرہ لگائے گی۔محبت کی آگ ایسی ہے جس میں کچھ نہ کچھ جھونکتے ہی رہنا پڑتا ہے۔۔۔۱۱

بانو قدسیہ محبت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے ایک ایک لمحے کو باریک بینی اور سنجیدگی سے بیان کرتی ہیں۔ان کے نزدیک

محبت کو محض روحانیت کے سہارے نہیں قائم رکھا جا سکتا بلکہ اس کے لیے جذباتی آسودگی بھی ضروری ہے۔ انسانی محبت کے کچھ تقاضے ہیں کیونکہ یہ خواہ کتنی ہی پاکیزہ اور صالح ہو لمس کا تقاضا کرتی ہے۔ محبت کے اس روّیے کو ہوس سمجھ لینا غلط ہے۔ کیونکہ محبوب کے قرب میں بعض لمس ایسے پاکیزہ اور لطیف ہوتے ہیں جو آبِ حیات بن کر محبّ اور محبوب کی زندگیوں کو سیراب کرتے ہیں اس لیے جسمانی ہوس کی بجائے اسے ایک صحت مند روّیہ سمجھنا چاہیے۔

> بادلوں میں بسنے والی اس لڑکی کے ساتھ ملکوتی محبت کو کئی سال گزر چکے تھے۔ وہ روحانی خط لکھ لکھ کر تھک چکا تھا۔ زرقا کی پرستش کرتے ہوئے اسے اتنی مدت بیت چکی تھی کہ اب اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح اس بت کو انسانی سطح پر لا کر پیار کرے۔ اس کے وجود کو محسوس کرے گرم چائے کی طرح۔ سگریٹ کے دھوئیں کی مانند۔۔۔ اپنے ملگجے تکیے کی طرح۔۱۲

زرقا کی محبت روحانیت کی قائل ہے۔ اس کے نزدیک وہ محبت جو قرب کی تمنائی ہو ہوس ہے۔ اگرچہ اسے معظم سے محبت کو پانچ سال بیت چکے ہیں اور اس دوران معظم نے کبھی قرب کی خواہش نہیں کی۔ اس لیے وہ معظم کو ایک دیوتا سمجھتی ہے۔ وہ محبت میں وصل سے خائف ہے۔ اس کے خیال میں وصل محبت کی تپسیا کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ اس لیے وہ سہمی ہوئی اور ایک طرف کھڑی محبت کی قائل ہے جو اس کی روحانیت کی محافظ بھی رہے اور اسے محبوب کے چاہے جانے کا احساس بھی دلاتی رہے۔

> معظم کے خط پڑھ کر اسے عجب طرح کا سکون ملتا۔ اسے لگتا جیسے مجّو دنیا کے تمام مردوں سے مختلف ہے۔ وہ گوشت پوست کا بنا ہوا مرد نہیں ہجر کا ایک شعر خیام کی اک رباعی ہے۔
> ایک حسین پھول ہے جو لمس سے ہمیشہ مرجھا جایا کرتا ہے۔
> زرقا کو اسی چیز کی مدتوں سے تلاش تھی۔ وہ مرد کی نظر میں عقیدت اور پرستش دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ان نظروں میں جسم کی والہانہ طلب سے نفرت تھی۔۱۳

جبکہ دوسری طرف معظم کی محبت وصل کی تمنائی ہے۔ اسے زرقا کی محبت کا جوگ لیے پانچ برس گزر چکے ہیں اس لیے اب وہ اپنی اس نرم رو محبت کی تھاپ سے تنگ آ چکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اب یہ رقص ختم ہو اور وہ اور زرقا ایک ہو جائیں۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ منوڑے والے پیر کے مزار پر بھی جاتا ہے اور وہاں زرقا کے وصل کی دعا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور اسے زرقا کے ساتھ خلوت کے چند لمحے نصیب بھی ہوتے ہیں لیکن انہی لمحوں میں وہ زرقا کی محبت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

> مجّو نے آہستہ سے زرقا کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور شہد کی اس دھار پر اپنے کڑوے اور خشک ہونٹ رکھ دیئے۔ زرقا کے لیے جیسے سٹور کا بلب فیوز ہو گیا۔ سارے فلیٹ کی بتیاں غائب ہو گئیں ۔ چاند پنہائیوں میں غوطہ لگا گیا ساری کائنات اندھیرے میں ڈوب گئی اور وہ بپھری ہوئی زخم خوردہ

شیرنی کی طرح حجّو سے علیٰحدہ ہوگئی۔۔۔خلوت کا لمحہ آ کر بیت چکا تھا۔۱۴

مصنفہ کے نزدیک روحانی محبت کا انسانی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔اس لیے ہمیں محبت کی جذباتی ضرورتوں سے منکر نہیں ہونا چاہیے۔یوں یہ ناولٹ محبت کے افلاطونی تصور سے بالکل ہٹ کر بدنی تقاضوں کو بیان کرتا ہے اور انسان کے فطری تقاضوں کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔

''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ نے مشرقی اور مغربی تہذیب کے تقابل سے انسان کی روحانی اور اخلاقی اقدار کے درمیان پیدا ہونے والے بُعد کو موضوع بنایا ہے اور اسے صوفیانہ نقطۂ نظر سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ناول میں ایک طرف مغربی معاشرت ہے جہاں اخلاقی اور روحانی اقدار پر مادی وسائل اور آلائشوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔شخصی آزادی کے متلاشی لوگ تمام حدود پار کر جانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔وہ اس بات سے یکسر بے خبر ہیں کہ قلب ونظر کا سکون وآرام مادی آسائشوں کی فراوانی میں نہیں بلکہ روح کی آسودگی اور اطمینانِ قلب میں ہے۔

جبکہ دوسری طرف مشرقی معاشرہ ہے جہاں ابھی تک تعلقات کی ڈور رشتوں کے ساتھ مضبوطی سے بندھی ہے اور لوگوں کے درمیان ایثار، محبت اور چاہت کی زنجیریں مستحکم ہیں۔مصنفہ کے خیال میں مشرق تصوف اور علم وعرفان کا سرچشمہ ہے اور یہیں سے انسانیت کی تشنہ روحیں سیراب ہوتی ہیں۔

> مشرق میں جب کوئی راہب، صوفی، جوگی تعلقات کی دھجیاں جوڑ کر رلی بناتا ہے تو اس گدّی پر بٹھانے کے لیے اسے آواز دیتا ہے جو نظر نہیں آتا۔مکمل فراق کی زنجیر سے بندھ کر ہر تعلق توڑ کر جوگی کی آزادی پابجولاں ہو جاتی ہے۔یہاں ایک اور تضاد کا بکھیڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ جوق در جوق اس سے تعلق پیدا کرنے کے لیے حاضری دیتے رہتے ہیں لیکن وہ تعلق کے پھندے میں بھی پھنستے نہیں اور اپنی will Free صرف اللہ کے امر کے سامنے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔صوفی ہر لمحہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ تعلق کے سمندر میں اپنی کشتی چھوڑ دے لیکن قطرہ بھر بھی کشتی کے اندر نہ آنے پائے۔اپنے غموں سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ تعلق کی رسی پانیوں میں پھینکنے کی بجائے اوپر کی طرف اچھالتا ہے اور تعجب اس بات پر ہے کنڈی اوپر لگے نہ لگے، وہ فلاح کے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں تعلق کے جھنڈے کی بھی اسے ضرورت نہیں رہتی۔۱۵

بانو قدسیہ نے مشرقی تہذیب میں تعلقات کی مضبوطی اور انسان پروری کو مذہبی حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ان کے نزدیک دینِ اسلام نے انسان کو جو عالمگیر انسانیت کا تصور دیا ہے وہی درحقیقت انسانیت کی معراج ہے تاہم وہ ان عالمگیر تصورات کو محض دینِ اسلام کے ساتھ مشروط قرار نہیں دیتیں بلکہ انھوں نے دیگر مذاہب میں بھی ان آفاقی اقدار کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ناول میں مصنفہ نے جا بجا بدھ ازم کے حوالے سے انسانی فلاح کی مختلف صورتوں کو بیان کیا ہے۔گوتم بدھ کا

دل جب اپنے باپ کی خود ساختہ جنت سے اوب گیا تو ایک شب وہ اپنی شاہانہ زندگی سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ کر گیان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ ایک ایسی زندگی کو تلاش کرنے لگا جہاں غموں کی چھایا ہو اور زندگی اپنے حقیقی رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ دکھ کی انسانی زندگی میں کیا اہمیت ہے اور یہ دکھ اسے تلاشِ ذات میں کہاں تک معاون ٹھہراتے ہیں لیکن چودہ سال کی ریاضت نے اسے یہ سکھایا کہ زندگی کی خوبصورتی محض اعتدال کا راستہ اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ مہاتما بدھ مغربی آزادی اور مشرقی فلاح کا عملی نمونہ ہے۔ اس نے اپنی پُر آسائش زندگی کو چھوڑنے کے بعد اپنے لیے غم خود دریافت کیے اور پھر ان غموں کو نروان کے وسیلے سے ختم کرنے کے لیے تپسیا کی۔ ''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ مہاتما بدھ کی تلاش ذات کے متعلق لکھتی ہیں۔

> وہ پہلا وجودی تھا۔ اپنی Free will پر وہ اس حد تک قابض ہو چکا تھا کہ اس نے اپنی تربیت کو بھی تعلیم میں ڈوب جانے کے بجائے تنہائی کا سبق دیا۔ سدھارتھ کا فیصلہ تھا کہ اگر آپ مکمل طور پر آزاد ہیں تو پھر اپنے نروان کے لیے کوشش بھی نہ کیجیے، دنیاوی ترقی مکمل فلاح کو ختم کر دے گی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد اگر آپ خواہشات کے غلام دھر لیے گئے اور دائرے کا سفر شروع ہو گیا تو یہ تعلقِ خواہشات بھی سب سے بڑی غلامی ہوئی۔۔۔ غلامی چاہے ترقی کی ہو یا فلاح کی غلام ہی رکھتی ہے۔ مہاتما بدھ کا خیال تھا جب تک انسان ان دونوں سے آزاد نہیں ہوتا، نروان مکمل نہیں۔ دونوں صورتوں میں دینی یا دنیاوی خواہش کا پٹہ اتارنا پڑے گا۔ ۱۶

''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ کی تمام تر فکر کا انت روحانیت ہے اور اسی کے پردے میں انھوں نے مغرب اور اس کی مشینی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عوارض کی تشخیص کی ہے۔ ان کے خیال میں مغربی معاشرہ ایسا کھوکھلا معاشرہ ہے جہاں روحیں جسم کے بغیر پنجروں میں مقید ہیں۔ اسی لیے مادیت کی کثافتیں انھیں انسانی آزادی کا راگ الاپنے پر مجبور کرتی ہیں۔

> نئی ترقی کی تمام تر توجہ پنجرے پر ہے۔ اسے طوطے کی پرواہ نہیں۔ پنجرے کا ڈیزائن، رنگ و روغن، اس کے اردگرد زیبائش، آسائش کا ہر ممکن فارمولا آج کی سوچ پر حاوی ہے۔۔۔ انسان اپنے جسم اور اس کی ضرورتوں میں اس درجہ مگن ہو گیا ہے کہ اسے اس جسم کی کوٹھڑی میں محبوس قیدی کی پرواہ نہیں رہی۔ وہ جسم سے وابستہ ہو کر بازاروں کا رمتا جوگی بن گیا ہے۔ ۱۷

بانو قدسیہ کے نزدیک چونکہ مغرب کی مادی ترقی کا راز مشینی زندگی میں ہے۔ اس سے ایک عام امریکی قرض کے بوجھ تلے دب کر خود فریبی کے عارضے میں مبتلا ہے۔ مصنفہ نے ناول میں ترقی کی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے انسان کی ذہنی پژمردگی کو دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس سفر میں سود و زیاں کے محرکات پر بھی بحث کی ہے۔

> دراصل یہاں وہاں انسان پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ ذہنی دباؤ سے نکلے۔ اسے طمانیت قلب، سکون

اور شانتی ملے ۔۔۔لیکن شاید معیشت اور معاشیات کو یہ کچھ درکار نہیں ۔ زندگی کا اصل راز اسی Stress میں ہے۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ فلاح کے راستے پر چلنے والے دباؤ کی گٹھری سر سے اتار کر ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ گردوپیش میں ٹھنڈی چاندنی کی طرح پھرتے ہیں ۔ نہ جہاں سوزی کا باعث بنتے ہیں نہ خودسوزی کا۔۔۔۱۸

''حاصل گھاٹ'' میں مغربی تہذیب کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مغرب نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے ۔ وہ محفل میں رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرنے لگا ہے ۔ انسان کی یہ ازلی تنہائی اور نا آسودگی تعلقات کی متلاشی ہے اور یہ تعلقات دراصل اس کے تحفظ اور تکمیل ذات کا حوالہ بنتے ہیں ۔ ناول کی ہیروئن اقبال انسانی تعلقات کو ایک ایسی چھتری کے مماثل قرار دیتی ہے جو ہر طبعی ، نفسیاتی اور جذباتی غم کا مداوا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔تعلق کے بارے میں ہمایوں کہتا ہے۔

انسان اس لیے کبھی خدا نہیں بن سکتا کہ اس کی ضرورت دوئی ہے حتیٰ کہ اگر اسے دوسرا نہ ملے تو وہ خدا کو اپنی دوئی کا حصّہ بنالیتا ہے۔۔۔انسان کی تنہائی قیامت خیز ہے۔۔۔جونہی اس خلاء کو بھرنے والا کوئی آجاتا ہے، انسان اپنی جنت میں پہنچ جاتا ہے اور اپنے آپ کو مکمل سمجھنے لگتا ہے۔۱۹

بانو قدسیہ نے ناول میں تعلق کی رمز کو صوفیانہ پیرائیہ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تعلق چیز ہی ایسی ہے ۔انسان کو بھگل کر دیتا ہے۔۔۔صوفیا تو کہتے ہیں کہ رستے کا سب سے بڑا حجاب ہی تعلق ہے ۔ نہ تعلق سے دل خالی ہوتا ہے، نہ اصلی قرار دل میں آتا ہے ۔ معمولی سے مہمان کے لیے کمرہ خالی کرنا پڑتا ہے ۔ پھر اوپر والے کے لیے تو چھوٹا سا بت بھی اندر رہ جائے تو اس کی سواری نہیں اترتی۔۔۔۲۰

ناول میں بانو قدسیہ نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان روح اور روحانیت کے حوالے سے نقطۂ اتصال تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک ناممکن امر ہے کیونکہ مشرق کی ساری طاقت کا سرچشمہ اس کی روحانیت، مذہب اور انسان کی داخلی دنیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں بانو قدسیہ نے روحانیت اور تصوف کے رموز سے دونوں تہذیبوں کے درمیان فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

مشرق کی روحانی ترقی اور چیز تھی اور مغرب کی معاشی ترقی اور علم ہے۔۔۔مغرب کی شاہراہ مادی و دنیاوی ترقی ہے اور مشرق کی پگڈنڈیاں فلاح کی جانب نکلتی ہیں۔۲۱

''شہر لازوال، آباد ویرانے'' ناول کے پہلے حصّے ''شہر لازوال'' میں رخشندہ کے کردار کے ذریعے صوفیانہ فکر کی عکاسی کی گئی ہے۔ رخشندہ پیشے کے لحاظ سے طوائف ہے اور اس نے اپنی ساری زندگی شہر کے بڑے بڑے امراء ورؤسا اور نوابین کی دل لگی کا سامان فراہم کرنے میں گزاری ہے۔ اس سارے عرصے میں سینکڑوں مردوں نے اس کی خوبصورتی کے قصیدے الاپے

ہیں اور اس سے اظہارِ محبت بھی کیا ہے لیکن رخشندہ کے دل میں کسی کے لیے محبت پیدا نہیں ہو سکی۔اب اس کی زندگی میں ایک موڑ ایسا آیا ہے جب وہ خود سے بے اختیار ہو کر ظفر سے محبت کرنے لگی ہے۔ظفر کی محبت نے اسے خود آگہی کے کرب سے آشنا کیا ہے اور وہ اپنی ہی ذات کی کھوج میں ایک نئے سفر پر نکل کھڑی ہوئی ہے۔اس محبت نے اسے ہر قسم کی نسلی و خاندانی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے اور وہ اس پابند دنیا میں رہتے ہوئے بھی خود کو آزاد محسوس کرنے لگی ہے۔

> وہ اب اس بادل کی مانند تھی جو ٹھنڈی ہواؤں کی تلاش میں اُڑتا رہتا ہے۔برس جائے تو رنج نہیں کرتا ۔للچا کر نکل جائے تو تاسف نہیں کرتا۔اس کا کسی نسل، کسی خاندان، کسی مسلک، کسی مذہب سے کوئی مثبت تعلق باقی نہ رہا تھا۔وہ ہر قسم کے تعصّبات سے پاک زندگی بسر کر رہی تھی۔وہ مائع کی طرح تھی جس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔جس پیمانے میں ڈالو اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔اس کے نظریات میں اتنی کشادگی یا کھوکھلا پن پیدا ہو چکا تھا کہ اب وہ گناہ اور ثواب سے یکساں پیار کرنے لگی تھی۔۲۲

صوفیاء کا ایک نظریہ وحدت الوجود ہے۔اس مکتبۂ فکر کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ خدا اور کائنات ایک ہی کُل کے دو جزو ہیں اور کائنات کی ہر شے کے اندر خدا کی ذات حلول کر گئی ہے۔گویا محبوب اور محبّ دونوں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔رشو بھی اپنے محبوب (ظفر) کی محبت میں اس منزل تک پہنچ گئی ہے جہاں وہ اپنے اور محبوب کے درمیان من و تو کے جھگڑے کو ختم کر کے محبوب کی ذات کا حصّہ بننا چاہتی ہے کیونکہ ایک صوفی کے لیے اپنے محبوب کا وجود ہی کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہوتی ہے اور اسی حقیقت کا سہارا لے کر وہ کائنات کے دیگر مظاہر کو جھٹلانے لگتا ہے۔رخشندہ کی محبت میں بھی یہ صوفیانہ فکر موجود ہے اس لیے وہ خود کو ختم کر کے اپنے محبوب کی ذات کا حصّہ بننا چاہتی ہے۔

> رخشندہ کا جی چاہتا تھا کہ ظفر اسے پیس کر قیمہ، بوٹیاں بنا کر کھا جائے۔وہ اس کے وجود کے اندر، اس کے معدے میں، اس کے لہو میں، اس کے سارے System میں جاری و ساری ہو جائے اور اس کے بعد اس Cannibalsim کے بعد ظفر کے ساتھ من و تو کا کوئی جھگڑا نہ رہے۔۲۳

ذکر، فکر، شغل، استغراق اور ریاضت تصوف کے مختلف مراحل ہیں۔ذکر کی پہلی منزل وہ ہے جب محبّ اپنے محبوب سے دور ہو تو اس کا تصور دھیان میں نہ آئے لیکن اس دوران محبّ اپنے محبوب کو یاد کرنے کی ریاضت کرتا ہے۔دوسرے مرحلے میں محبوب کا تصور دھیان میں لایا جا سکتا ہے لیکن دوری کے باعث فراق کی کسک باقی رہتی ہے۔جبکہ تیسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہی سالک اپنے وجود سے غافل ہو جاتا ہے اور محبوب سامنے بھی موجود ہو تب بھی محویت کے باعث اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔رخشندہ بھی ظفر کی محبت میں ذکر کی اوّلین منازل طے کرنے کے بعد محویت کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اس لیے جھنگ کے مشاعرے میں ظفر کو ایک دفعہ اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر اسے دوبارہ دیکھنے کی حاجت محسوس نہیں ہوئی۔

> اس نے جیسے صدیوں کے بعد ظفر کو دیکھا۔۔۔اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔اس کے بعد اسے ظفر کی طرف دیکھنے کی ضرورت تک محسوس نہ ہوئی۔۔۔وہ جو کئی گھروں میں، کئی ہوٹلوں میں، کئی ڈبل بیڈ،

کئی قالینوں پر آڑی ترچھی جلیبی کی مانند گاؤ تکیے کی طرح بوجھل سلوٹوں سے پاک شکنوں سے آراستہ وقت گزار چکی تھی۔۔۔ظفر کی ایک نظر کو گھر کے حدود اربعہ سے تعبیر نہ کر سکی۔۲۴

رشو ظفر کی محبت میں روحانی، جسمانی اور قلبی سطح پر اتنا طویل سفر طے کر چکی ہے کہ اس کے لیے زماں و مکاں کی پابندیاں بے معنی ہو گئی ہیں۔اس لیے جھنگ کے مشاعرے میں جب اس کا سامنا ظفر سے ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اور محبوب کے درمیان چار صدیوں کا فاصلہ حائل ہو گیا ہے۔

قوالی کے بعد مشاعرے کی ایک مخصوص نشست کوٹھی کی چھت پر منعقد کی گئی تھی۔اسی مشاعرے میں اس نے پورے چار سال چار صدیاں چار قرن کے بعد ظفر کو دیکھا۔۲۵

محبت کائنات کی ایسی خوبصورت حقیقت ہے جس میں محبوب کا چہرہ محبّ کے لیے کعبہ بن جاتا ہے اور کائنات کی دیگر خوبصورتیاں اس کے سامنے مانند پڑنے لگتی ہیں۔رخشندہ کی محبت میں بھی ایسی ہی استقامت موجود ہے اور اسے اپنے محبوب کے چہرے کے سامنے زندگی کی دیگر دلچسپیاں ختم ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔

ساری محفل کلکاریاں مار کر ہنس دی۔صرف رخشندہ ظفر کو دیکھتی رہی۔وہی ماتھا، وہی ہونٹ، وہی پورن بھگت جیسی خوبصورت چپ۔۔۔اس کے بعد رخشندہ نے کسی شاعر کا کلام نہ سنا۔ وہ آنکھیں بند کر کے گاؤ تکیے پر بازو کا بوجھ ڈال کر یوں بیٹھی رہی جیسے کسی معبد کا بت ہو۔جب اوس سے قالین اور گاؤ تکیے بھیگنے لگے اور سارے میں سبز چائے کی خوشبو آنے لگی تو رخشندہ نے محسوس کیا جیسے ظفر اس کے پاس آ بیٹھا۔۲۶

ظفر کی محبت نے رخشندہ کو وحدت سے کثرت کی طرف گامزن کر دیا۔وہ اب ہر محبت کرنے والے کے چہرے میں اپنا عکس ہی دیکھتی ہے اور محبت کرنے والوں کے دکھ کو وہ سانجھا سمجھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر فہیم کے کلینک میں پھول ونتی کو دیکھ کر اسے اس میں اپنا عکس نظر آنے لگتا ہے اور پھول ونتی کی تکلیف رخشندہ کو اپنی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

رخشندہ کے دل نے کہا۔۔۔پھول ونتی! تو ٹھیک سمجھتی ہو گی کہ منیر کو تجھ سے بڑی محبت ہے۔لیکن ہو سکتا ہے تیری ماں بھی ٹھیک ہی سمجھتی ہو۔۔۔کیونکہ ہر قیمتی چیز کی طرح محبت اتنی عام نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔یہ تو ہیرے کی کان سے بھی زیادہ نایاب ہے۔سچائی سے بھی کہیں زیادہ سولی پر چڑھاتی ہے۔اس کی توفیق تجھے، مجھے اور منیر کو کہاں پھول ونتی!۔۔۔تو اور میں پھول ونتی۔۔۔ہم تو فقط جسم سے صدا دیتے ہیں اور جسم کی بھول بھلیوں میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔ہمارے لیے محبت کیسی؟۲۷

''کاشف کی کہانی'' میں بانو قدسیہ نے انسانی نفس میں اچھائی اور برائی کی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ایک صوفی جب راہِ سلوک کے سفر پر نکلتا ہے تو قدم قدم پر شر کی طاقتیں اس کے ارادوں کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن سالک اپنے نفس پر قابو پا کر ہر مرحلے پر ثابت قدمی سے دوچار ہو جاتا ہے۔جبکہ ایک عام انسان کے لیے ان شر پسند قوتوں کو مات دینا بہت مشکل

ہوتا ہے۔''کاشف کی کہانی''میں بانو قدسیہ نے عبدالرحمٰن کے کردار کے ذریعے ایک عام انسان کے نفس میں ہونے والی خیر اور شر کی جنگ کو بیان کیا ہے جس کے نتیجے میں شر خیر پر غلبہ پالیتا ہے اور عبدالرحمٰن مجرم بن کر خود اپنی ہی ذات کے کٹہرے میں آ کھڑا ہوتا ہے۔

> سر! مجھے حوالات میں بند کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے سمجھایئے کہ نیکی کیا ہے۔۔۔اس کی عمارت ایک اینٹ نکالنے سے ساری کی ساری کیوں ڈھے جاتی ہے۔۔۔ایک غلط خیال،ایک بے خیالی میں کیا ہوا غلط عمل ساری نیکی میں خمیر کی طرح کیوں لگ جاتا ہے۔۔۔کیا چیز ہے جو ہمیں نیک نہیں رہنے دیتی۔۔۔نیکی کافی کیوں نہیں ہے سر۔۔۔کسی انسان کے لیے اس کے سہارے ۔۔۔فقط نیکی کے سہارے زندہ رہنا ممکن کیوں نہیں؟ ۲۸

برائی کا یہ سفر اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان نفس کی اشتہا کا سامان فراہم کرنے لگتا ہے۔نفس کی اشتہا میں پہلی چیز زبان کا ذائقہ ہے یوں پہلی خرابی معدے کے ذریعے داخل ہوتی ہے اور پھر خوش خوراکی کا یہ سفر بڑی سرعت کے ساتھ انسان کو برائیوں کی دلدل میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔

> سر! ساری بدی انسان میں اس کے پیٹ کے راستے سے داخل ہوتی ہے۔جو لوگ صرف کھانے پر کنٹرول رکھتے ہیں وہ اپنی ساری خواہشات کو قابو میں رکھ سکتے ہیں۔پہلے آدمی کا معدہ جاگتا ہے پھر ۔۔۔اس کی آنکھ ہوس کا شکار ہوتی ہے۔۔۔جب آنکھ قابو میں نہیں رہتی تو پھر جنس حملہ آور ہوتی ہے۔ ۲۹

''آباد ویرانے''میں آشوب زمانہ سے تنگ آئے ہوئے بانو قدسیہ کے کردار خود آگہی و خود شناسی سے دوچار ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔یہ کردار اپنی ذات اور کائنات کے اسرار و رموز کے حوالے سے سوال کرتے نظر آتے ہیں۔شوکت مغل کا کردار بھی حالات کی اسی بھٹی سے گزر کر خود شناسی کے مرحلے سے دوچار ہوتا نظر آتا ہے۔وہ خدا کے وجود سے منکر نہیں لیکن معاشرے میں ہونے والی تباہی و بربادی خاص طور پر رشتوں کی پامالی پر وہ دل گرفتہ ہے۔اس لیے وہ روحانی و اخلاقی سطح پر خود سے سوال کرتا نظر آتا ہے۔

> ہم زندگی کے بہاؤ میں کچے گھڑے کی طرح بہہ رہے ہیں اور زندگی کے بہاؤ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم نہ ہوں گے تو کوئی ہم سا ہو گا۔۔۔انسان کے لیے یہ بات ماننا اتنا آسان نہیں کہ اس کی Replacement اتنی جلدی اور اس سے بہتر ہو جاتی ہے۔۔۔عورت کو غالباً مرد سے بہت پہلے جوانی میں ہی اس بات کی سمجھ آ جاتی ہے کہ ہر قدم پر اس جیسی اس سے بہتر موجود ہے۔۔۔کیا آدم میں اللہ کی پھونکی ہوئی روح کا یہ فساد تھا؟
> حادث کو قدیم کی خواہش تھی؟

فانی کو امر ہو جانے کی تمنا؟
کیا آدمی میں چھپی ہوئی انا نے یہ سارا مسئلہ کھڑا تھا
انسان کیا یہی چاہتا تھا کہ وہ ناگزیر ہو؟ وہ نہ ہو تو تلافی نہ ہو سکے؟ خلا رہ جائے۔۳۰

شوکت خدا کے وجود کو دل سے تسلیم کرتا ہے اور اسے ان تمام نعمتوں کا بھی ادراک ہے جو خدا نے اسے عطا کی ہیں لیکن ان تمام مادی آلائشوں کے باوجود اس کے اندر ایک بے چینی اور ایک کلبلاہٹ موجود ہے۔ وہ خود شناسی کے جس سفر پر نکل کھڑا ہوا ہے وہاں نفسانی خواہشات کو ختم کر دینا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس لیے وہ ان خواہشات سے پیچھا چھڑانے کے لیے فرار کا راستہ ڈھونڈتا ہے لیکن یہ فرار اسے مادی دنیا کے اندر رہتے ہوئے کہیں نہیں مل سکتا۔

میں ایسی بے مصرف زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس زندگی کا ضرور کوئی بڑا مطلب کوئی بڑی منزل ہو گی ۔۔۔ اتنی بیکار زندگی اللہ کی مرضی سے نہیں ہو سکتی ۔۔۔ ہاں۔ ہاں سب کچھ ہے ۔۔۔ جو کچھ انسان سوچ سکتا ہے، سب ہے ۔۔۔ لیکن میں آدم کا بیٹا ہوں ۔۔۔ سعیدہ تم ۔۔۔ سمجھ نہیں سکتیں۔ میرے اندر کہیں جنت سے نکل جانے کی خواہش بھی ہے
۔۔۔ جنت بھی میرے لیے زنجیر ہو سکتی ہے۔۳۱

اسی آگہی کی تلاش میں شوکت شہر کی آسائشات چھوڑ کر گاؤں پہنچتا ہے یہاں وہ اپنی زندگی صفر سے شروع کرتا ہے تاکہ آسائشات کی عدم موجودگی میں وہ اپنی ذات کے مفہوم اور اس کی معنویت سے آشنا ہو سکے۔ یہ درحقیقت اس کی ذات میں موجود خلاء ہے جو اسے ہر وقت بے چین کیے ہوئے ہے۔ شوکت کے کردار میں موجود اس بے چینی اور اضطراب کا کہیں نہ کہیں تعلق عشق مجازی و حقیقی کے ساتھ ہے۔ اس کے دل میں محبت کا جو بیج پھوٹا وہ بارآور ہوئے بغیر ہی مرجھا گیا۔ چنانچہ محبت کی اس محرومی نے شوکت مغل کی شخصیت میں ایک خلاء پیدا کر دیا ہے۔

کیا اوما کسم نالنی نے میرے دل میں کانٹوں کا درخت بو دیا تھا جو ہر رُت میں ۔۔۔ صرف کانٹے اگا سکتا تھا ۔۔۔ خزاں میں بھی اس میں کانٹے بچتے اور بہار میں بھی اس کی شاخوں پر نئے کانٹوں کا اضافہ ہو جاتا ۔۔۔ لیکن اوما کی یادیں اب کسک نہیں دیتی تھیں ۔۔۔ بس وہ ایک یاد تھی ۔۔۔ ایک واقعہ، ایک فوٹو جو میرے ذہن کے البم میں کہیں لگی تھی ۔۔۔ اوما یادوں کے سنگھاسن پر بیٹھی ضرور تھی لیکن تصویر کی مانند۔۳۲

ناول میں بعض جگہ بانو قدسیہ کے صوفیانہ خیالات پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس صوفیانہ فکر کے پس پردہ اخلاقی سبق دے رہی ہیں۔ یہ صوفیانہ لب و لہجہ ان کی تحریر میں ایک فلسفی معلم کی طرح اپنا فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اس فلسفے کے ذریعے وہ انسان کو نفس کی دنیا کے جھگڑوں، نفس کے مختلف مدارج اور خواہشات کے سامنے انسانی نفس کی بے بسی کو بھی واضح کرتی ہیں۔

نفس کی نچلی ترین سطح حیوانی ہے جہاں بندہ جانوروں کی طرح حواس خمسہ کے سہارے فقط اپنی اشتہا

کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے۔کھانے کو چاہا کھالیا۔کسی کے ساتھ سونے پر راضی ہوئے تو سو لیے۔ چھین جھپٹ کر اپنی منوالی۔سیدھی انگلی گھی نکل آیا تو صحیح۔۔۔اسی حیوانی سطح پر نہ قلب چالو ہوتا ہے نہ روح اطمینان میں رہتی ہے۔عقل کی استدلالی قوت بھی زائل ہو جاتی ہے اور تجسس پیش پیش رہتا ہے۔۳۳

''پروا'' میں بھی متصوفانہ فکر کی عکاسی عیاں ہے۔اس ناولٹ میں بانو قدسیہ نے محبت سے متعلق رومانوی نظریات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔انھوں نے محبت کو محض جسمانی پہلو تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں روحانی پہلوؤں کو بھی اہمیت دی ہے۔ صوفیہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والی ایک محبّ وطن لڑکی ہے۔وہ مادیت سے زیادہ اخلاقیات اور روحانیت کی قائل ہے۔اس کے دل پر محبت کی حکمرانی ہے اور وہ سچے جذبوں کی متلاشی ہے۔اس کی محبت محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ وہ انسانوں کی روح سے محبت کرتی ہے۔جسمانی محبت چند روزہ اور جلد ہی اکتاہٹ کا باعث بن جاتی ہے جبکہ روح سے کی جانے والی محبت دیرپا ہوتی ہے۔روحانی پہلو کے بغیر محبت محض ہوس ہے۔صوفیہ کے دل میں بھی ایسی ہی محبت کا سمندر موجزن ہے۔وہ دھرتی اور اس دھرتی کے باسیوں سے محبت کرتی ہے اور یہی خوبی اسے دوسری تمام عورتوں سے ممتاز کر دیتی ہے۔

محبت کے روحانی پہلو کے متعلق جو نظریات ناولٹ میں موجود اطالوی لڑکی انا پیش کرتی ہے وہ کسی خاص خطے یا زبان کے لیے مخصوص نہیں بلکہ زمان و مکاں سے ماورا ہیں۔

> انسان ہر جگہ انسان ہے اس پر نہ قوم نہ وطن نہ ملت نہ نسل غالب آسکتی ہے اور تمہارے اردگرد اس وقت خدا جانے کون سی قوموں کے لوگ بیٹھے ہوں گے لیکن تم ان کی محبت میں اس طرح گرفتار ہو جاؤ گی جیسے وہ تمہارے ماں جائے ہوں جیسے انھوں نے تمہارے ہی ڈھاکہ میں جنم لیا تھا۔۔۔یہ غم بڑا ہی لطیف ہوتا ہے جیسے عورت پہلی محبت کرتی ہے۔جب پہلی مرتبہ اسے احساس ہوتا ہے کہ اب چاند راتوں میں محض گڑیا کو سلاتے سلاتے نیند نہیں آئے گی پہلی محبت اور اس کا ان جانا مزہ۔اس کا لطیف سا غم جیسے حلق میں شہد کی مٹھاس اور کونین کی کڑواہٹ اکٹھی گھل مل گئی ہوں۔۳۴

ناولٹ کا مرکزی کردار اختر بھی روحانیت کا طلبگار ہے۔کراچی سے رخصت ہوتے وقت اختر دوراہے پر کھڑا تھا۔ایک طرف اختر چچا کے ساتھ بلیک مارکیٹنگ کرتا ہے۔اسے زندگی کی تمام آسائشات میسر ہیں۔خالدہ اس کی چچازاد اور منگیتر ہے وہ ایک بزنس مین کی بیٹی اور کروڑوں کی اکلوتی وارث ہے اور اختر اس سے شادی کر کے پُرتعیش اور بےفکری کی زندگی گزار سکتا ہے۔جبکہ دوسری طرف صوفیہ کی محبت ہے۔صوفیہ آسائشوں کی متمنی نہیں۔وہ ایک محبّ وطن، مذہبی اور ہر شخص کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنے والی ہے۔اس کے نزدیک مادیت پرستی، بناوٹ اور تصنع محض وقتی چیزیں ہیں۔وہ محبت، خلوص اور سچائی کو حقیقی زندگی متصور کرتی ہے۔اختر کا دل صوفیہ کی طرف مائل جبکہ دماغ خالدہ کی جانب لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔وہ عجیب مخمصے سے دوچار ہے اور فیصلے کی سولی پر لٹکا ہوا ہے۔اسے خیر اور شر کی جنگ کا سامنا ہے۔بالآخر خیر کی جیت ہوتی ہے اور وہ لاہور پہنچ کر

دوبارہ کراچی کی ٹرین سے پلٹ جاتا ہے۔ وہ خالدہ پر صوفیہ کو ترجیح دیتا ہے۔ مادیت پرستی کی بجائے زندگی کی حقیقی سچائیوں کا قدردان ہے۔ درحقیقت انسان زندگی کی مادی اقدار کے پیچھے جتنا مرضی بھاگے لیکن بالآخر وہ ان آسائشات اور تصرفات سے اکتا جاتا ہے۔ مادی دولت اسے وقتی آرام، سکون اور راحت سے تو ہمکنار کر سکتی ہے مگر روحانی خوشیوں سے محروم رکھتی ہے۔ وہ سچے جذبوں اور حقیقت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اختر کا صوفیہ کی طرف میلان بھی اس کا مادی زندگی سے فرار حاصل کرنا اور حقیقی زندگی کا سامنا کرنا ہے۔

الغرض مصنفہ نے اپنے ناولوں میں ان افراد کی نشاندہی کی ہے جو اپنے مرکز سے ہٹنے کے باعث مختلف ذہنی، معاشرتی ،اور نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک نئی نسل کی بے راہ روی کی وجہ صرف اور صرف مذہب سے دوری ہے جس کے باعث ان کی زندگی انتشار اور بے چینی سے دوچار ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ ان تمام باتوں کا تانا بانا فکری لحاظ سے تصوف سے جوڑ دیتی ہیں جو کہ جدید نسل کے تمام مسائل کا واحد حل ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳

۲۔ ایضاً، ص ۵۷

۳۔ ایضاً، ص ۱۴

۴۔ ایضاً، ص ۲۰۱

۵۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۶۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، ویلکم بک لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹۴

۷۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۹۲

۸۔ ایضاً، ص ۳۸۳

۹۔ ایضاً، ص ۴۴۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۳۳

۱۱۔ بانو قدسیہ، چہار چمن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۹۔۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۵

۱۵۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۸۳

۱۶۔ ایضاً،ص۸۴

۱۷۔ ایضاً،ص۴۴

۱۸۔ ایضاً،ص۳۲۔۳۳

۱۹۔ ایضاً،ص۸۵

۲۰۔ ایضاً،ص۱۲۲

۲۱۔ ایضاً،ص۴۳

۲۲۔ بانو قدسیہ،شہرِ لازوال،آباد ویرانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۱ء،ص۱۰

۲۳۔ ایضاً،ص۱۱

۲۴۔ ایضاً،ص۱۱

۲۵۔ ایضاً،ص۱۲

۲۶۔ ایضاً،ص۱۳

۲۷۔ ایضاً،ص۲۷

۲۸۔ ایضاً،ص۵۷

۲۹۔ ایضاً،ص۵۵

۳۰۔ ایضاً،ص۳۵۷

۳۱۔ ایضاً،ص۳۵۱

۳۲۔ ایضاً،ص۲۵۲

۳۳۔ ایضاً،ص۳۶۷

۳۴۔ بانو قدسیہ، چہار چمن،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۹ء،ص۱۸۳